# مسئلہ قربانی اور مسلمان

از

(حضرت مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند)

ارباب فکر و نظر جب کسی اہم مسئلہ پر غور کرتے ہیں بنیادی مقصد ایک ہوتے ہوئے بھی اکثر و بیشتر اُن کے فکر کی دو جدا جدا راہیں بن جاتی ہیں جن کو ہم افہام و تفہیم کی غرض سے تخیلی اور عملی کے نام سے پکار سکتے ہیں۔

میدانِ تخیل کا گامزن معاملہ کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے اول چند نظری مقدمات بناتا ہے اور پھر واقعات کی رفتار کو اپنے مزعومہ مقدمات کے سانچہ میں ڈھال کر ایسا نتیجہ نکالتا ہے جو واقعات و حقائق سے جدا بلکہ بعض مرتبہ اُن کے برعکس ایک نئی حقیقت کی تخلیق کا سبب بن جاتا ہے اور وہ پیش پا افتادہ حقیقت اپنی جگہ تشنہ ہی رہ جاتی ہے اور بسا اوقات مستور اور پوشیدہ ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس عملی طریق فکر کا حامل اصل حقیقت کی تہ تک پہنچ کر صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب رہتا اور مقصد کو ہر قسم کے نقصان و ضرر سے محفوظ رکھ کر اس کی تقویت کا باعث بنتا ہے نیت اور ارادہ اگرچہ دونوں کا پاک اور بے لوث ہوتا ہے مگر مقصد تک پہنچنے یا اس کو قوی تر بنانے میں اکثر و بیشتر پہلا ناکام اور دوسرا کامیاب نظر آتا ہے۔

اس نازک دور میں بھی جبکہ ملک و وطن کے اہم مسائل کے ساتھ ساتھ مسلمانوں سے متعلق بعض خصوصی اور اہم سے اہم تر مسائل زیر غور اور زیر بحث ہیں ہمارے ارباب فکر مسطورہ بالا دونوں راہوں پر چل کر مسائل حل کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق مسلمانوں کو مشورے دے کر اُن کی مشکلات کے حل اور مصائب و آلام کے

انسداد کی فکریں کر رہے ہیں۔

ان ہی پیچیدہ مسائل میں سے ایک مسئلہ جو آج ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے قدم رکھنے کی ہزار سالہ تاریخ میں بہت بڑے عرصہ سے ہمیشہ پیچیدہ بنا رہا ہے "قربانی گاؤ" کا مسئلہ ہے۔

"گائے" ہندوؤں کی مذہبی تقدیس کا ایک اہم جزء ہے اور اس درجہ اہم ہے کہ ہندو مذہب کے تمام متوں کو یہی گائے ایک مرکز پر جمع کر دیتی ہے یہ تصویر کا ایک رخ ہے دوسرا رخ یہ ہے کہ ہندو مذہب کے علاوہ اسلام، عیسائیت، یہودیت وغیرہ مذاہب میں گائے کو بھی ان جانوروں میں شمار کیا گیا ہے جن کا گوشت انسان کے لئے پاک اور حلال ہے اس لئے قدرتی طور پر ان مذاہب کے پیرودں میں اس جانور کی مذہبی تقدیس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس مسلمانوں کے اہم مذہبی تہوار "عید قرباں" میں جو کہ حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کی جانب سے حق تعالیٰ کے سامنے اپنی قربانی پیش کرنے کی یادگار کا بہترین شاہکار ہے مخصوص حلال جانوروں کی قربانی کی فہرست میں یہ بھی شامل ہے اور یہی نہیں بلکہ ایک عرصہ دراز کے بعد مسلمانوں کے عام اقتصادی حالات کے پیش نظر اس مسئلہ نے اس لئے بھی اہمیت حاصل کر لی کہ قربانی کے مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ بکرا۔ بھیڑ۔ دنبہ ایک شخص کی جانب سے ایک ہی ہو سکتا ہے مگر اونٹ، بھینس اور گائے میں سات اشخاص شریک ہو کر قربانی کا فریضہ ادا کر سکتے ہیں اور ہر بکرے کی اور بڑے جانور کی قیمت کا اگر موازنہ کیجئے تو صاف نظر آتا ہے کہ جو سات اشخاص جدا جدا سات بکرے کرنے کی مالی حیثیت سے قدرت نہیں رکھتے وہ آسانی سے ایک بڑے جانور کی قیمت میں شریک ہو کر اپنے فریضہ کو ادا کر لیتے ہیں اور جبکہ اس ملک میں اونٹ کمیاب ہے تو بھینس اور گائے اور ان دونوں کی نسل ہی سے کام لیتے ہیں مسلمانوں کی اقتصادی حالت کس درجہ کمزور ہے اس کا اندازہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ملک کے تمام باشندوں کو ہے اس لئے قربانی کے موقعہ پر

بکرے اور دنبہ کی قربانی کم اور بڑے جانوروں کی قربانی زیادہ کرنے کا سبب یہی اقتصادی مجبوری رہی ہے اور ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا ہرگز ہرگز اس کا باعث نہیں ہوا

البتہ گذشتہ پچاس ساٹھ برس کے عرصہ میں انگریزوں کی غلامی کے ساتھ ساتھ جب ملک میں حقوق طلبی کی بحث نے سیاسی رنگ اختیار کیا اور ایک اجنبی سامراجی طاقت نے اپنی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لئے ہندو مسلمان کو جدا جدا حیثیت دے کر مذہبی اور معاشرتی منافرت کا پارٹ ادا کیا اور اس کے نتیجہ میں ہندو اور مسلم دونوں تہواروں میں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی تب یہ مسئلہ بھی بدقسمتی سے دونوں فرقوں کے درمیان باہمی منافرت اور باہمی کش مکش کا ذریعہ بنا لیا گیا۔

ہندو بھائی آنکھوں سے دیکھتے کہ انگریزوں کی چھاؤنیوں میں روزانہ ہزارہا قسم کی گائے کٹتی ہیں اور وہ اس کو برداشت کر لیتے لیکن تین سو ساٹھ دنوں میں سے ایک دن جب عید قرباں کے نام سے اکثر و بیشتر ناکارہ اور دودھ سے بیگانہ ذبح کی جائیں تو جانور کے نام پر انسانوں کی قربانی سے دریغ نہ کرتے۔

اسی طرح مسلمان یہ محسوس کرتے ہوئے بھی کہ اس خاص جانور کے ذبح سے برادران وطن کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں انھیں بڑے جانوروں میں سے اسی جانور کی قربانی افضل نظر آنے لگی۔

مگر یہ سیاسی بحران خلافت کی نیک تحریک نے یکدم پامال کر کے ملک میں پہلے سے بھی زیادہ دونوں فرقوں کے درمیان یک جہتی پیدا کر دی اور ایک دوسرے کے جذبات کا پاس و لحاظ سکھا دیا جس کا معمولی مظاہرہ یہ تھا کہ عید قرباں کے موقع پر حکیم اجمل خاں صاحب کی تحریک پر دہلی میں جہاں سیکڑوں گائے قربان ہوا کرتی تھیں حکومت کی پوری مخالفانہ طاقت کے باوجود مشکل سے دو یا تین گائے ہو سکی تھیں۔

اس سے یہ بخوبی اندازہ ہو گیا کہ مسلمانوں کی عام ذہنیت اس طرح کی واقع ہوئی

ہے کہ محبت اور جذبات خلوص کے ساتھ اگر ان کی جان بھی طلب کی جائے تو وہ دریغ نہیں کرتے اور بعض وہیش کو بزدلی تصور کرتے ہیں لیکن کسی معاملہ پر قوت آزمائی کے ذریعہ قابو حاصل کرنے کی سعی کی جائے تو اس کے سامنے سر جھکانا اپنی توہین سمجھتے اور جا و بے جا ہر طریقہ پر اس کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں خواہ اس مقابلہ میں خود ان ہی کو شدید خسارہ اور نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔

چنانچہ ۱۹۲۳ء میں جب تحریک خلافت کمزور پڑگئی اور حکومت سے نبرد آزما ہندو مسلم طاقت آپس میں ہی دست و گریباں ہونے لگی حتی کہ مذہبی تہوار بھی اس زد سے نہ بچ سکے اور سیاسی بخار کا ٹمپریچر دونوں جانب سے مذہبی شکل میں چڑھنے لگا اور دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ ایک مرتبہ پھر اس مسئلہ کو خالص مذہبی اور اقتصادی حدود سے نکال کر سیاسی رنگ میں دیکھا جانے لگا اور ہندو مسلمان دونوں ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کی پروا کئے بغیر اور بلند اخلاقی معیار سے منہ موڑ کر مذہبی رسوم میں ایک دوسرے کو زک دینے ہی کو بڑا مذہبی کارنامہ سمجھنے لگے۔

بہرحال کہنا یہ تھا کہ دراصل مسلمان عید قرباں میں بڑے جانوروں کی خصوصاً آسانی سے بکثرت سستے داموں دستیاب ہو جانے کی وجہ سے دودھ سے بیگانہ اور ناکارہ گایوں کی قربانی خالص مذہبی اور اقتصادی نقطۂ نگاہ سے کرتے تھے اور اس معاملہ میں ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا اور ان کو چڑانا مقصود نہیں ہوتا تھا تاہم دونوں جانب کے لیڈروں اور فرقہ پرست رہنماؤں نے ضرور موقعہ بہ موقعہ اس مسئلہ کو سیاسی رنگ دے کر باہمی منافرت کو ہوا دے کر دونوں فرقوں کے درمیان کشیدگی اور نفرت کے جراثیم کے لئے غذا کا کام دیا۔

ملک کے متعدد مسلم سنجیدہ اور صاف دماغ مدبروں اور سیاسی بلند پایہ رہنماؤں نے جستہ جستہ کوشش کی کہ کسی طرح یہ مسئلہ حل ہو جائے تاکہ دونوں فرقوں کے درمیان اعتماد اور یکجہتی کی فضا قائم ہو سکے اور مذہب کے نام پر سیاسی حربہ نہ بن سکے لیکن افسوس صد افسوس کہ قوم پرور

مدبران ملک کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی اور فرقہ پرستوں اور اجنبی سامراجی طاقت کی مہربانیوں کی وجہ سے یہ اخلاقی مسئلہ سیاسی الجھنوں میں پھنس کر رہ گیا۔

یہ اس مسئلہ کا پس منظر ہے جو بغیر کسی ذمہ داری کے واقعات کی حقیقی روشنی میں پیش کیا گیا ہے تاکہ اس نازک زمانے میں اس مسئلہ پر جو کچھ کہا یا لکھا جائے اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر ہو اور ہم کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں۔

ہندوستان ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوگیا اور انگریزوں کی سامراجی حکومت کے پنجۂ استبداد سے اس کو پوری طرح آزادی نصیب ہوگئی لیکن اس نے اپنے ترکہ میں ہندوستان کی تقسیم اور بٹوارہ چھوڑا جو ملک کے باشندوں کو "خواہ وہ پاکستان میں ہوں یا بھارت میں ہندو ہوں یا مسلمان" بہت مہنگا پڑا اور تباہی و بربادی کا وہ نقشہ سامنے لایا تاریخ جس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز و درماندہ ہے۔

اس موقف پر پہنچ کر ملک کے دونوں حصوں میں ہندو اور مسلمان کی سیاسی اور اجتماعی حیثیت میں سابق کی بہ نسبت بہت بڑا تفاوت ہوگیا اور ہندوستان کی وحدت کی صورت میں جو وزن مسلمانوں کا بھارت کے حصہ پر ہوسکتا تھا وہ باقی نہ رہا اور جو قیمت ہندو کی پاکستان کے حصہ میں ہوسکتی تھی وہ پادر ہوا ہوگئی اور کل جن متنازعہ فیہا مسائل میں پورے ملک کے اندر ایک دوسرے کی رضا اور قبولیت از بس ضروری اور ناقابل نظر انداز سمجھی جاتی تھی آج دونوں حصوں کی اکثریت کی نگاہ میں ان مسائل کے حل کرنے میں اقلیت کا فیصلہ اور اس کی رائے سیاسی تو کجا اخلاقی حیثیت میں بھی کچھ زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔

بحث اس میں نہیں ہے کہ ہونا کیا چاہئے پیش نظر یہ ہے کہ ہو کیا رہا ہے اور گذشتہ دور کے فرقہ وارانہ قضیوں کے حل کے لئے عملی زندگی میں آج اور کل کے درمیان کیا تفاوت اور فرق ہے؟۔

اشارات و مضمرات میں موجودہ صورت حال کا جو جائزہ سطور بالا میں لیا گیا ہے اس

کو سامنے رکھئے اور اب غور کیجئے کہ "قربانی گاؤ اور مسلمان" کے عنوان پر جن حضرات نے حالیہ مضامین میں اظہار خیال کیا ہے اس کی نوعیت کیا ہے اور کیا مسئلہ کو اس طرح زیر بحث لاکر ہم واقعی حل کر سکتے ہیں یا حل کرنے کی بجائے جن مسلمانوں کی جان و آبرو کی خاطر اس مسئلہ کو سپرد قلم کیا گیا ہے ان کے لئے مزید مشکلات کا باعث بن رہے ہیں؟

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ برادر عزیز مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ نے برہان بابت اکتوبر ۱۹۵۰ء کے شذرات میں عید اضحیٰ کے حالیہ فسادات سے متاثر ہوکر گائے کی قربانی سے متعلق اظہار خیال کرتے اور اس مسئلہ کی شرعی حیثیت پر بھی روشنی ڈالتے ہوئے اس جانب جو توجہ دلائی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ عید قرباں کے موقعہ پر گائے کی قربانی کے نام سے بھارت میں مسلمانوں کے خون کی جو ارزانی ہوتی ہے اس کے متعلق ہم دو طرح غور کر سکتے ہیں ایک یہ کہ گائے کی قربانی ایک امر مباح ہے پس اس امر مباح کو اگر حکومت قانون اور قوت کے بل پر روک دے اور مسلمانوں کو مجبور کر دے تو ایسی صورت میں مباح بھی واجب الادا ہو جاتا ہے خواہ اس کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو دوسرے یہ کہ حکومت نے اس کو نہ قانون کی راہ سے روکا ہے اور نہ قوت کے بل پر روکنا چاہتی ہے تو مسلمانان ہند اجتماعی حیثیت میں اس کا فیصلہ کریں کہ جبکہ گائے برادران وطن کی مذہبی تقدیس کا اہم شعار ہے تو ہم اعلان کرتے ہیں کہ آئندہ گائے کی قربانی ہرگز ہرگز نہ کریں گے تاکہ برادرانِ وطن کی دل آزاری بھی نہ رہے اور مسلمانوں کی جان عزیز بھی خطرہ میں نہ پڑے۔

موصوف نے ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی پہلو کے متعلق خود کوئی فیصلہ کن رائے نہیں دی بلکہ علماء کرام خصوصاً جمعیۃ علماء ہند کو دعوت دی ہے کہ وہ جلد از جلد اس کا فیصلہ کریں البتہ ان کا رجحان یہ ضرور ہے کہ اس مسئلہ کا فیصلہ دوسری صورت کے مطابق ہونا چاہئے مولانائے موصوف کا یہ شذرہ اپنی جگہ اگرچہ قابل قدر اور لائق توجہ ہے لیکن میری تمہید کے مطابق تخیلی ہے عملی نہیں اور وقت کے تقاضا کے پیش نظر مضر ہے مفید نہیں اس لئے نہیں

نہ ایسا نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس لئے کہ یہ بعد از وقت بھی ہے اور قبل از وقت بھی اور اس لئے آج ایسا ہونا برادران وطن کی نگاہ میں بے وقعت اور بے معنی ہے اور اگر مجھ کو زیادہ جرأت کے ساتھ کہنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ موجودہ حالات میں یہ مستحسن ترک کار نہ اخلاقی قدر و قیمت رکھتا ہے اور نہ سیاسی اور نہ اس سے مسلمانوں کی جان عزیز ہی خطرہ سے بچ سکتی ہے غرض جو حل پیش کیا گیا ہے وہ تقسیم ہند کے بعد "حل" کہلا سکتا ہے لیکن "حل" بن نہیں سکتا۔

کیوں ؟ اس لئے کہ موصوف نے پہلی بات "جس پر اس مسئلہ کی بنیاد رکھی ہے" یہ فرمائی ہے۔

اس نفسیاتی الجھن اور بیم و رجا کی اس جاں گداز کشمکش کا اصل باعث گائے کی قربانی کا مسئلہ ہے یہ مسئلہ ہمیشہ سے ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں کشیدگی اور کشاکش کا سبب بنا رہا ہے اور اب ملک کی تقسیم جن حالات میں ہوئی ہے ان کی وجہ سے اس کی نزاکت اور بھی بڑھ گئی ہے چونکہ یہ خالص مذہبی معاملہ ہے اس لئے علماء کا فرض تھا کہ تقسیم کے بعد ہی فوراً اس کے متعلق کوئی متفقہ فیصلہ کر کے مسلمانوں کی راہنمائی کرتے تاکہ گومگو کے عالم میں رہنے کے باعث جان و مال کا جو خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے اس سے نجات ملتی اور صورت حال کا کوئی خوشگوار حل نکل سکتا لیکن افسوس کہ علماء نے ایسا نہیں کیا اور اب ایسا مرحلہ آگیا ہے کہ اگر ان کی خموشی کا یہی عالم رہا تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے نتائج کتنے خطرناک اور افسوسناک ہوں گے (انتہیٰ)

نشان زدہ عبارت یہ جتلا رہی ہے کہ تقسیم کے بعد چونکہ علماء نے گائے کی قربانی کے ترک کا فیصلہ نہیں دیا اس لئے مسلمانوں کو جان و مال کا خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے مجھے حیرت ہے کہ مولانائے موصوف نے اس مسئلہ کی انتہائی نزاکت سے باخبر ہونے کے باوجود اتنا بڑا بوجھ علماء پر یا خود مسلمانوں پر ڈال دیا ہے اور حقائق و واقعات سے چشم پوشی

کا حسب مرت زا ثبوت دیا ہے۔ کاش وہ اس حقیقت پر نظر رکھتے کہ تقسیم ہند کے بعد مسلمان عملاً قربانی گاؤ ترک کئے ہوئے ہیں اور علما کا فیصلہ ہونے نہ ہونے سے قطع نظر وقت نے خود ان کی رہنمائی کا فرض انجام دیا ہے تاہم عید قرباں کے موقع پر گذشتہ سالوں میں خصوصًا امسال جو فسادات ہوئے ہیں اُن کے متعلق خود سرکاری کمیونکے مظہر ہیں کہ مسلمانوں نے ان مقامات پر گائے کی قربانی نہیں کی تھی لیکن فرقہ پرست ہندوؤں نے مسلمانوں کی جان و مال کو نقصان پہنچانے کے لئے عید قرباں کو بہانہ بنا کر خون کی ہولی کھیلنا ضروری سمجھا چنانچہ بنسر اؤں (سہارنپور)، شوہر (متھرا)، دولت پور (الہ آباد)، مگری (اعظم گڈھ)، لکھنؤ۔ جلیل (دھاگل پور بہار) سینہور (بھوپال)، کے فسادات اس حقیقت کو بخوبی واضح کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہئے وہ یہ کہ حکام کے اس بات سے مطمئن ہونے کے باوجود کہ مسلمان گائے کی قربانی نہیں کریں گے انھوں نے اکثر مقامات پر یہ فہمائش کی کہ اگر آپ بھینس یا بھینس کی نسل کی قربانی بھی کریں گے تو چونکہ ذبح کے بعد بڑے گوشت کے درمیان یہ فرق مشکل ہے کہ گائے کا ہے یا بھینس کا اس لئے مسلمانوں کے لئے احتیاط کا تقاضا ہے کہ وہ قانونی پابندی نہ ہوتے ہوئے بھی ایسا نہ کریں ورنہ فساد کی ذمہ داری سے وہ بھی سبکدوش نہیں رہیں گے۔

ایسے حالات میں اگر علماء یہ متفقہ فیصلہ دے بھی دیں تو انصاف کیجئے کہ اس فیصلہ کی قدر و قیمت کیا ہے اور کس طرح مسلمانوں کی جان و مال کا خطرہ اس فیصلہ سے ٹل سکتا ہے بلکہ معاملہ کو اگر دور رس نگاہ سے دیکھا جائے تو یکطرفہ یہ فیصلہ مسلمانوں کی جان و مال کے لئے مزید خطرہ بن سکتا ہے کیونکہ مفسد عناصر جن مقامات پر فساد کرنا چاہیں گے وہاں کے مسلمانوں پر یہ مجرمانہ الزام عائد کریں گے کہ اس مقام کے مسلمانوں نے نہ صرف ہندوؤں کی دل آزاری کی بلکہ خود اپنے علماء کے متفقہ فیصلہ کی خلاف ورزی کی اور گائے کی قربانی کر کے دو سنگین جرموں کے مرتکب ہوئے اس لئے ان کا صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ہی بہتر ہے۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کا خوف وہراس یا مصلحت وقت کے پیش نظر گائے کی قربانی نہ کرنا زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جو علماء کے متفقہ فیصلہ سے پیدا ہو سکتی ہے مگر یہ بھی درست نہیں ہے اس لئے کہ کسی قوم یا کسی فرقہ کا مذہبی یا سیاسی یا اخلاقی متفقہ فیصلہ جب ہی دوسری قوم یا دوسرے فرقہ کی نگاہ میں لائق اعتنا اور قابل وقعت ہو سکتا ہے جب عملی زندگی میں وہ دوسروں کے ہم پلہ اور قوت وطاقت میں دوسروں کے ہمسر ہی نہ ہو بلکہ اس درجہ میں ہو کہ اگر دوسرے اس کے فیصلے کو نظر انداز بھی کر دینا چاہیں تب بھی نظر انداز نہ کرنے پر مجبور ہوں ورنہ اس دنیا میں کمزور اور ضعیف عناصر کے فیصلے کھوٹے سکہ سے زیادہ وقیع نہیں ہوتے۔

درحقیقت اس فیصلہ کی قدر وقیمت یا آزادی سے قبل کے دور میں تھی اور یا آزادی کے بعد جب ممکن تھی کہ ملک کی تقسیم نہ ہوتی اور پورے ملک میں ہر حیثیت سے دونوں بڑے فرقے ایک دوسرے کی ٹکر اور برابر کے سمجھے جاتے اور ایک کے فیصلہ کا اثر دوسرے کو قبول کرنا ناگزیر ہوتا۔

البتہ مسلمانوں کو جان ومال کے خطرہ سے بچانے عید کے موقعہ پر ان کے چہروں پر حزن وملال کی جگہ بشاشت ومسرت پانے اور گائے کے نام سے ہندو مسلم فسادات روکنے کی غرض سے صحیح حل تلاش کرنے کی بنا پر نہیں بلکہ علماء کا یہ متفقہ فیصلہ اس غرض سے کرانا مقصود ہے کہ مسلمانوں کو اپنی اخلاقی بلندی کا ثبوت دینے کے لئے ایسی بات کے ترک کا متفقہ اعلان کر دینا چاہیئے جس سے برادران وطن کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے خواہ آج کے دن اس کی اخلاقی قدر وقیمت بھی کچھ نہ سمجھی جائے لہذا یہ ایک تخیلی حل تو بن سکتا ہے عملی حل نہیں ہو سکتا۔

کیا دونوں ملکوں کی اکثریت اس زعم باطل میں گرفتار نہیں ہے کہ جو متنازع فیہا مسائل کل تک حل نہیں ہو سکے یا اجنبی طاقت نے حل نہیں ہونے دیئے وہ آج اکثریت کی آزاد زبردست طاقت نے اس طرح حل کر دئے کہ اب ان کو متنازع فیہا مسائل کہنا بھی

ہے اور کل جو معاملات اخلاق، محبت، رواداری اور وطنیت و قومیت کے نام پر طے نہ ہو سکے آج اکثریت کی طاقت نے بہ آسانی حل کر دیئے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک کی اقلیت اگر آج آزاد فضا میں اخلاق و مروت کے نام پر کسی پُرانے قضیہ کا حل تلاش کرے تو اکثریت اس کو اسلئے مضحکہ خیز سمجھنے پر آمادہ نظر آتی ہے کہ اس کے نزدیک یہ فیصلہ اقلیت کی مغلوبیت اور مرعوبیت کا نتیجہ ہے نہ کہ اخلاقی برتری اور بلند کرداری کا یا کم از کم باہمی امن و سلامتی سے رہنے کے لئے صلح جویانہ جذبہ کا، چنانچہ آج اس مسئلہ "قربانی گاؤ" سے متعلق بھی بہت سے سنجیدہ دماغ یہی سوچتے اور زبان سے یہی کہتے نظر آتے ہیں کہ اب اس ملک میں اس اقدام کے لئے مطلق گنجائش نہیں ہے تو ایسی صورت میں مولانائے موصوف کا علمائے کرام کی خاموشی کو مورد الزام بنا کر ایک غیر موثر فیصلہ کی دعوت دینا ہرگز قرین دانشمندی نہیں ہے بلکہ وقت کے محرکات و عوامل سے چشم پوشی کے مرادف ہے۔

البتہ مسلمان اگر (العیاذ باللہ) اپنے مذہب کو پس پشت ڈال کر اس حد تک جرأت بیجا پر آمادہ ہو جائیں کہ ہندو دنیا کی طرح وہ بھی گائے کی تقدیس کو شعار بنالیں تو شاید یہ متفقہ فیصلہ اکثریت کے نزدیک درخور اعتنا بن سکے بشرطیکہ اس فیصلہ میں بھی ان کو کسی جگہ بوئے منافقت محسوس نہ ہو اور پھر اس کے ازالہ کے لئے ایک اور متفقہ کانفرنس منعقد کرنے کی ضرورت پیش نہ آجائے۔

بہر حال موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا عملی حل دو شکلوں میں سے ایک شکل میں ہو سکتا ہے، (۱) یہ کہ مرکزی حکومت اعلان کرے کہ اگرچہ حکومت قانونی طور پر کسی جانور کی قربانی ممنوع قرار نہیں دیتی لیکن ملک کے فرقہ وارانہ حالات کو روبہ اصلاح کرنے کی خاطر یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ گائے اور اس کی نسل کے علاوہ مسلمان مذہبی نقطۂ نظر سے جس جانور کی بھی قربانی کرنی چاہیں کریں حکومت اس معاملہ میں ان کی مدد کرے گی اور جو ان کے جائز حق میں مداخلت کرے گا وہ قانون کی خلاف ورزی کا موجب ہوگا۔ اور نہ صرف یہ اعلان کرے بلکہ سرگرمی کے ذریعہ تمام

صوبائی حکومتوں کو توجہ دلائے کہ اضلاع اور قصبات و دیہات میں حکام اس حکم کی پوری طرح پابندی کریں اور اس جائز حق کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مجرم قرار دیں۔

یہ فیصلہ بظاہر خوش آئند معلوم نہیں ہوگا اور سطحی نظر سے کہا جائے گا کہ اس سے تو ہزار درجہ بہتر ہے کہ مسلمان خود ہی متفقہ طور پر یہ اعلان کر دیں کہ وہ گائے اور اس کی نسل کی قربانی کو بخوشی ترک کرتے ہیں۔ لیکن دور رسی کے ساتھ اگر اس پر غور کیا جائے تو پھر یہ اشکال خود بخود دور ہو جائے گا۔

کیا سطور بالا میں جو تصریحات کی گئی ہیں اس کے بعد بھی یہ خلجان رہ سکتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی جانب سے بہتر سے بہتر فیصلہ بھی اکثریت کی نگاہ میں قابل پذیرائی نہیں ہو سکے گا اور اس لئے امن و امان کا معاملہ بھی خاطر خواہ ترقی نہ پا سکے گا اس لئے حکومت کا فیصلہ ہی ان حالات میں مؤثر اور امن و سلامتی کا بظاہر اسباب کفیل ہو سکتا ہے البتہ حکومت کے اس فیصلہ کو کامیاب بنانے میں پبلک کی امداد اور اس کا تعاون ضروری ہے

دوسرا حل یہ ہے کہ سیاسی موقف سے بالاتر ہو کر اکثریت کی جانب سے اقلیت کو دعوت دی جائے کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے ہم حکومت کی جانب نہ دیکھیں بلکہ دونوں فرقوں کے ایک نمائندہ اجتماع میں متفقہ فیصلہ کریں جس کی پشت پر طاقت کی بجائے رواداری محبت اور ایک دوسرے کے جذبات کا احترام ہو تب البتہ مولانا سعید احمد صاحب کی یہ پکار وقت کی پکار کہی جا سکتی ہے اور بلاشبہ اس وقت خاموشی مجرمانہ حیثیت رکھ سکتی ہے۔

اور اگر ان دونوں حل کی آج کوئی صورت بن نہیں آتی تو خواہ مخواہ خود کو بے قیمت و بے وقعت بنانا کیا ضروری ہے ایسے عمل اقدام سے خاموشی ہزار درجہ غنیمت کیوں نہیں۔

رہا عید اضحیٰ کے موقعہ پر فرقہ پرستوں کی جانب سے فسادات کا ہنگامہ اور گائے کی قربانی نہ کرنے کے باوجود اس کا بہانہ بنا کر خوں ریزی کرنا تو کسی قسم کا حل بھی آپ سوچئے یہ تو اپنی شرارت پسند حرکات سے باز آنے سے رہے۔ ان مفسدوں اور شرارت پسندوں کا علاج

ایگرمنٹ ہے اور نہ متفقہ فیصلہ اور نہ کوئی حل بلکہ حکومت کی ملوی طاقت اور امن پسند پبلک کی ان کے خلاف نفرت ہی اس کا صحیح علاج اور انسداد کا بہترین ذریعہ ہے۔

اور یہ بات قابل اطمینان ہے کہ ان تمام ایں واں اور چنیں دچناں کے باوجود ہندو بھائیوں میں بھی ایسے صاف دماغ، صاف قلب اور نیک سرشت انسان موجود ہیں جو اب بھی یہ سوچتے ہیں کہ اس قسم کے مسائل کو باہمی رواداری اور ایک دوسرے کے جذبات کے پاس ولحاظ سے ہی حل ہونا چاہئے اور طاقت کے بل پر ہرگز نہیں ہونا چاہئے اور یہی وہ حضرت ہیں جو آج بھی مسلمانوں کے اس قسم کے فیصلہ کی وقعت کرنے پر آمادہ ہیں مگر اس مکدر فضا میں ابھی وہ اتنی قوت نہیں پاتے کہ اپنے فرقہ کی اکثریت کو بھی اپنا ہم خیال بنالیں۔

تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں حالات سے مایوس ہوں اور یہ کہ ملک کے حالات کی رفتار یہی رہے گی نہیں ہرگز نہیں ۱۹۴۷ء سے آج تک میرا مشن بھارت کے گوشہ گوشہ میں جد وجہد کرتا رہا ہے اس کا ہر ایک ذرہ شاہد ہے کہ میں مایوسی کو کفر اور احساس کہتری کو سب سے بڑا گناہ سمجھتا ہوں اور بحمد اللہ اس میں کامیاب ہوں۔

حالات آہستہ آہستہ بدل رہے ہیں اور برادران وطن میں جو حضرات صاف دماغ اور وطن عزیز کے سچے رہنما اور خادم ہیں آج ان کی مبارک کوشش بار آور ہو رہی ہیں اور فرقہ پرستی کا زہر کم ہوتا جا رہا ہے اور وہ وقت دور نہیں ہے کہ یہ ملک اپنے دستور اور روح کے مطابق ہر ایک شہری کے لئے باعزت مساویانہ زندگی کا حامل ہوگا اور صحیح معنی میں سیکولر اسٹیٹ بن جائے گا تب البتہ وہ وقت آئے گا کہ مسلمان اگر اس مسئلہ میں اپنے بلند کرداری کا ثبوت پیش کرنا چاہیں گے تو اس کی قدر و قیمت بھی ہوگی اور وہ مقصد بھی انشاء اللہ پورا ہو سکے گا جس کی جانب بیان کے شذرات میں توجہ دلائی گئی ہے۔

# مولوی محمد

از

جناب منشی عبدالقدیر صاحب

آپ کا اصلی نام سردار بہادر سنگھ ولد سردار ہیرا سنگھ ولد سردار جھنڈا سنگھ تھا۔ قصبہ فرید آباد ضلع منٹگمری کے رہنے والے تھے اور معزز سکھ زمیندار گھرانے کے فرد تھے۔

قصبہ فرید آباد کی آبادی مخلوط تھی کہتے ہیں جس نے ضلع گوڑگانواں کے فرید آباد کو آباد کیا تھا اسی نے یہ قصبہ بھی آباد کیا تھا فرید آباد کی مہندی مشہور ہے اور منٹگمری والے فرید آباد کی شہرت اس لئے ہے کہ اس کے ہر گھر میں ایک ایک یا دو دو چھتے مینوں (بڑی سرخ رنگ کی بھڑ یا ڈیموں کے ہیں)، کہتے ہیں کسی وقت یہاں دو جنگیں ایسی ہو چکی ہیں جن کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ ایک جنگ تیتوں اور موہجہ کلاں (بڑی بڑی ٹانگوں کے چیونٹے یا ڈھک مکوڑے) میں دوسری جنگ کوؤں اور بگلوں میں ہوئی اور ان میں لکھو کھا چیونٹے اور تیتے کوے اور بگلے مارے گئے اور میدان لاشوں سے پٹ گئے یہ جنگیں ہفتوں تک جاری رہیں۔

قصبہ میں ایک اسکول تھا اس کے صدر مدرس ایک فاضل مولوی صاحب تھے لڑکے مولوی صاحب کی حسن تربیت، طریقہ تعلیم اور شفقت سے بے حد مانوس تھے۔ ٹیکسٹ بک کمیٹی کے منظور شدہ نصاب تعلیم کے علاوہ مولوی صاحب خالی اوقات میں اکثر طلبار کو قصص الانبیاء کا بھی درس دیا کرتے تھے۔ لڑکے شوق سے پڑھتے تھے اور ان کی بے حد خدمت کرتے تھے قصبہ کے باشندے بھی ان کی تعظیم و تکریم کرتے تھے اور ان کی خدمت کو سعادت کا باعث خیال کرتے تھے۔

ایک روز ایک ذیلدار صاحب مدرسے میں آئے اور مولوی صاحب کو علیحدہ لے

جاکر اصل بات بتائی اور کہا کہ میں پانچویں جماعت کے طلبا کا امتحان لینا چاہتا ہوں میں ذیل دار ہوں۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ میری ایک اکلوتی لڑکی ہے جسے میں نے ناز و نعمت سے پالا ہے اب وہ شادی کے قابل ہو گئی ہے اس کی کتخدائی کی فکر دامنگیر ہے۔ باوجود تلاش کے کوئی لڑکا میری مرضی کے مطابق نہیں ملا۔ اب میں نے یہ طے کیا ہے کہ لڑکوں کا امتحان لوں جو سب سے قابل نکلے۔ میں بر توکل اسی کے ساتھ شادی کر دوں۔ آپ بھی اس کار خیر میں میری مدد فرمائیں۔

مولوی صاحب نے اس طریقۂ انتخاب کو پسند کیا اور امتحان لینے کی اجازت دے دی چنانچہ ذیل دار صاحب نے ایک ایک لڑکے سے مختلف سوال کئے اور ہر ایک کی ذہنی اور فکری قابلیت کا اندازہ لگایا۔ اس آزمائش میں بہادر سنگھ اول آئے بعد اطمینان مولوی صاحب اور ذیل دار صاحب بہادر سنگھ کے والد کے پاس گئے۔ بات پختہ ہو گئی اور چند روز کے بعد بڑی دھوم دھام اور چاؤ سے ذیل دار صاحب نے اپنی لڑکی بہادر سنگھ کے ساتھ بیاہ دی۔ چنانچہ ابتدائی رسوم کے بعد لڑکی سسرال میں رہنے لگی۔

کچھ عرصہ بعد بہادر سنگھ اور ان کے تین ساتھیوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ قصبہ سے نکل چلو۔ ایک نے طے کیا کہ وہ جوگی بنے گا باقی تین نے تبدیل مذہب کا ارادہ کیا۔ وقت کے وقت قصبہ والوں کو چاروں لڑکوں کی سازش کا علم ہو گیا اور باہم چرچے ہونے لگے کہ کیا کیا جائے دو لڑکے تو اپنے والدین کے قابو چڑھ گئے اور دو نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے مفرورین کے تعاقب میں اہل دیہ گھوڑوں پر نکلے مگر کسی کا کھوج نہ لگا۔ جوگی بننے والے کا تو پتہ ہی نہیں کہ وہ کس پہاڑ کی کھوہ میں جا بیٹھا۔ مگر بہادر سنگھ سیدھے مولوی حافظ عبدالمنان صاحب کے پاس وزیر آباد پہنچے اور مشرف با سلام ہو کر ان ہی کے پاس رہنے اور دینیات پڑھنے لگے کیسوں کو ٹھوں میں تبدیل کر لیا۔ ایک سال کے بعد قصبہ والوں کو ان کا سراغ مل گیا چنانچہ بہت سے اقربا، وزیر آباد آئے اور سمجھا بجھا کر بہادر سنگھ کو ہمراہ لے گئے اور وہاں ان کی کڑی نگرانی رکھی

ظاہر ہے بہادر سنگھ کے ساتھ نرم گرم سبھی قسم کا سلوک ہوا ہوگا مگر بہادر سنگھ نے کہا میں تو اسلام قبول کر چکا اب کسی شرط پر لوٹنے کے لئے تیار نہیں ہوں آپ کا جو جی چاہے کیجئے سب کچھ برداشت کروں گا۔ اس بات سے دونوں وقت کھانا کھاتے میں ایک کہرام سا مچا کرتا تھا کیونکہ بہادر سنگھ چوکے کے باہر کھانا کھاتے تھے۔

بہادر سنگھ پر حقانیت غالب آچکی تھی۔ صداقت ان کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ ان ہر وقت کے مظاہروں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا ایک روز موقع پاکر پھر وہ کھسک گئے اور سیدھے لاہور پہنچ گئے اور کسی مسجد میں مقیم ہوکر دینی تعلیم کے حصول میں منہمک ہو گئے۔ گذارہ کے لئے دو ٹیوشن تلاش کرلئے۔ تقریباً سال بھر کے بعد یہاں بھی ان کو کسی نے پہچان لیا۔ چنانچہ ان کے والد دوبارہ لاہور آکر ان کو فرید آباد لے گئے اور سخت نگرانی میں رکھا اس دو ڈھائی سال کے عرصہ میں وہ کافی لکھ پڑھ گئے تھے اچھے خاصے جوان اور سوچ سمجھ والے ہو گئے تھے۔ جب لوگ ان کو سمجھاتے تو وہ بدلائل ان کو قائل کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے والد صاحب کے رویہ میں تبدیلی ہوگئی وہ مائل بہ اسلام ہوتے گئے اور عقیدۃً مذبذب ہو گئے بہادر سنگھ کو انھوں نے ڈھیل دے دی کہ جس رنگ میں رہنا چاہو رہو خوش رہو اور نگرانی ترک کر دی۔

بہادر سنگھ کے دماغ میں دینی تعلیم کا شوق گھر کر چکا تھا۔ ہر وقت اسی فکر میں رہتے کہ ہو سکے تو پھر قصبہ سے چلا جاؤں چنانچہ موقع پاتے ہی وہ دارالعلوم دیوبند پہنچے اور چند سال میں وہ فارغ التحصیل ہوکر دہلی آگئے اور فتحپوری میں مقیم ہوئے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ دہلی میں کہاں کہاں تعلیم پائی۔ بہرصورت دہلی میں ان کی بہت قدر ہوئی۔ شمس العلماء مولوی نذیر حسین صاحب عرف میاں صاحب کے باعث پھاٹک حبش خاں میں ان کو ایک مکان کرایہ پر ملا مولوی عبدالمجید صاحب مناظر کے مطبع انصاری میں کتب دینیات کے مصحح ہو گئے۔ آپ کا میل جول شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی۔ مولوی عبدالرب صاحب میر شاہجہاں صاحب۔ مولوی تلطف حسین صاحب دھیرہم اور دیگر بزرگوں سے ہوگیا اور ان کی قابلیت کے جوہر کھلے تو مولوی نذیر احمد صاحب